تصدیق
جلد ۰۲ شمارہ ۰۵، ۲۰۲۳

*Article*

# Ahmad Bashir’s Maktoob Writing

# احمد بشیر کی مکتوب نگاری

**Dr. Muhammad Riaz Ahmad (Riaz ) [1], Dr. Farah Abid*[2], Dr. Nadia Anjum[3]**

[1]Department of Urdu, Govt. College University, Faisalabad
[2]Department of Urdu, Govt Islamia Graduate College for Women, Faisalabad
[3]Assistant Professor, Department of Urdu, Govt. Associate College for Women Ayub Research, Faisalabad.
*Correspondence: farahabid2e@gmail.com

[1] ڈاکٹر محمد ریاض احمد (ریاض)، ڈاکٹر فرح عابد[۲]، ڈاکٹر نادیہ انجم[۳]

[1]شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد، [۲]شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ گریجویٹ کالج برائے خواتین فیصل آباد

[3]اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین ایوب ریسرچ، فیصل آباد

**eISSN**: 2707-6229
**pISSN**: 2707-6210
**DOI:**https://doi.org/10.56276/zme02w16
Received:03-12-2023
Accepted:21-12-2023
Online:31-12-2023

**Copyright:** © 2023 by the authors.

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

**ABSTRACT:** "Ahmad Bashir was a renowned journalist and a literary icon of Urdu. He wrote essays / articles and columns equally in English and Urdu. Among the several of his journalistic and literary facets, sketch-writing, novel-writing and editorial-writing are worth-mentioning. He got education in film-making from America, and then started film-making and direction in Pakistan. He produced few documentaries, and made the first and the last to date belly film of Pakistan "Chirree Kahaani" that achieved an award in belly film festival of Iran. He chose journalism for making his livelihood, and learnt journalism from Charagh Hassan Hassrat in the daily "Amroz". He was called the founder of Urdu feature-writing. He wrote his debut feature on Gaamma Pehalwaan. After the daily "Amroz", he started writing for the weekly "Qandeel". He never sticked long to a newspaper owing to his truthfulness and ideological thoughts. He exhibited his writing power, along with editorial writing, in both English and Urdu journals and newspapers like: "Chataan", "Lail-o-Nahaar", "Nawa-e-Waqt", "Jang", "Musawaat", "Friday Times", "The Muslim", "The Star", "The News" and "Frontier Post". His last writing, featuring the journalistic, political, analytical and ideological characteristics,

continued to publish in the monthly "Naya Zamaana" from Lahore. His style held truthfulness and candidness. He had to write uder different false names due to the atrocities of the government. He adopted the names of Bhulley Shah, Shah Anyat and Ahmad Khan Kharal for this purpose. He never let the journalistic and literary values fall a prey to worldly strategies and impurities. He was a staunch socialist and flag-bearer of social justice.

**KEYWORDS:** Ahmad Bashir, Journalist, Literary Icon, Sketch-Writing, Novel-Writing, Editorial-Writing, Truthfulness.

خط نگاری کے ابتدائی آثار یا نقوش ہمیں قدیم یونانی، عراقی اور مصری تہذیبوں میں ملتے ہیں اور یہ انسان کے لکھنے پڑھنے کے ہنر کی ایک اہم ارتقائی لڑی ہے جو ترقی کرتے کرتے آدھی ملاقات کے مقام تک براجمان ہوئی۔ عربی زبان میں لفظ خط کے معنی تحریر یا لکیر کے ہیں اور کتابت کے معنی لکھنا یا لکھائی کے ہیں۔ اس سے تحریریں لکھوانا یا نامہ و پیام مراد لیا جاتا ہے۔ مظفر عالم جاوید لکھتے ہیں:

"خط عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی تحریر یا لکیر کے ہیں۔ کتابت بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔"(۱)

مکتوب نگاری انسانی جذبات یعنی ذاتی، عمرانی معاملات یعنی معاشرتی، یادِ ماضی یعنی تاریخی اور زمانی اور مکانی سچائیوں اور جہتوں کی لذتوں اور حقیقتوں کی حامل ہوتی ہے۔ مکاتیب دلی اظہار کا ذریعہ ہونے کے ساتھ زندگی کے ہر پہلو پر مشتمل ہوتے ہیں یعنی ان میں علمی و ادبی چاشنی اور معلومات کا خزانہ ہونے کے ساتھ ساتھ ثقافتی، مذہبی، معاشی، سیاسی، تنقیدی اخلاقی، اصلاحی، سماجی اور تجارتی رنگ بھی ہوتے ہیں۔ خط لکھنے کا بہر حال ایک مقصد ہوتا ہے اور بغیر مقصد کے خط میں بھی ایک مقصد پوشیدہ ہوتا ہے اور وہ مقصد دلی جذبات کو لفظوں کی عبا سے نوازنا ہوتا ہے اور یا پھر کم از کم اس نام سے عشق ہونے کا حق ادا کرنا ہوتا ہے۔

احمد بشیر کی ادبی اور صحافتی زندگی ساتھ ساتھ چلتی ہے کیونکہ انہوں نے صحافت کے کارزار میں قدم جمائے ہیں اور کالم نگاری اور فیچر نگاری کے ساتھ ساتھ قلم کے ہنر کو اپنی مکتوب نگاری میں بھی آزمایا اور یہ آزمائش احمد بشیر کے ۱۹۵۸ء میں امریکا جانے کی وجہ سے شروع ہوئی۔ انہوں نے وہاں سے اپنی بیگم محمودہ احمد بشیر کو خطوط لکھے اور پیار و محبت، مروت اور جذبات کی سچائی سے معمور اور سرشار ہو کر لکھے۔ ان خطوط میں احمد بشیر اپنے امریکا میں قیام کا احوال بھی بتاتے ہیں اور امریکی معاشرے کی جھلکیاں بھی دکھاتے ہیں۔ اس کتاب میں محمودہ احمد بشیر کے نام امریکا سے لکھے گئے سینتیس خطوط شامل ہیں اور اپنے بچوں کے نام امریکا اور پاکستان سے لکھے گئے خطوط کی تعداد ۱۶ سولہ ہے۔ ممتاز مفتی کے نام مکاتیب انتیس ہیں، دو خط ارشاد احمد حقانی، ایک مشفق خواجہ، دو خطوط جمیل الدین عالی اور ایک خط افتخار عارف کے نام ہے۔ بچوں میں نیلم، پپو گوپی مانو بیٹا ہومی، داماد سراج، عباس، شاہد اور اقبال کے نام شامل ہیں اور سب سے زیادہ شامل کتاب

خطوط احمد بشیر کے منہ بولے بیٹے مجید کے نام ہیں اور ان کی تعداد چھیاسٹھ ہے۔ یوں ایک سو چیاسٹھ خطوط اس مجموعے میں جسے احمد بشیر کی ادبی جانشین بیٹی نیلم احمد بشیر نے مرتب کیا اسے ۲۰۰۶ء میں الفیصل پبلشرز لاہور نے شائع کیا۔

ان خطوط میں ادبیانہ شان عالمانہ عظمت، تاریخی صداقت، سیاسی ریاضت اور ثقافتی خوشبو بسی ہوئی ہے اور ان سب سے بڑھ کر حقیقت اور سچائی کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ ان مکاتیب سے مصنف کی شخصیت کے کئی گوشے بے نقاب ہوتے ہیں اور ہمیں ادھورے کی بجائے پورے احمد بشیر سے آگاہی ہوتی ہے۔ مکتوب نگاری کا اصل حسن اس کے نجی ہونے میں ہے اور نہج سے مکتوب نگار اپنے کسی دوست یا ہمراز یا شاملِ حیات کو لکھتا ہے تو اس یقین کے ساتھ کہ بات کسی اور کو معلوم نہیں ہو گی یا ہو نہیں سکتی ہے۔ احمد بشیر کے ان مکاتیب میں بھی وہ بے ساختگی موجود ہے بلکہ بڑے نمایاں انداز میں موجود ہے۔ وہ باتیں جو ایک بے تکلف دوست کے ساتھ ہوتی ہیں یا ایک شوہر کی بیوی سے ہی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً:

"میں تم سے زیادہ منتظر ہوں اور بے قرار بھی۔"(۲)

"آج یہ چار دن ہوئے تمہارا خط آئے، یہ کیا شرافت ہے۔ مانا تم بہت پیاری ہو مگر پیا کو مار ہی ڈالو گی؟"(۳)

"تمہارے خیال سے کچھ بچے تو کسی کے کام آئے مگر تم تو ایسی ہو گئی ہو کہ سارا پیار پی گئی ہو۔"(۴)

"کوئی دکھ نہیں اک دکھ تیرا سانوں ڈھول جانی"(۵)

"لوگ مجھے رنگیلا سمجھتے ہیں آخر میں ہوں بھی تو رنگیلا۔ ہے نا پیاری، مگر صرف تمہارے لیے۔"(۶)

"دعا کرو کہ جلد ملیں۔ جدائیاں بہت لمبی پڑ گئی ہیں۔"(۷)

"میرے آنے تک جن جن سہیلیوں سے ملنا ہے مل لو۔ چاہے روز ملو لیکن واپسی پر بالکل فرصت نہ ہو گی۔ اچھی طرح ریجھ اتار لو پیاری، پھر تو یا میں ہوں گا یا تم ہو گی۔"(۸)

"یہاں سردی بہت ہے اور تم نہیں اور گرم ہونا مشکل ہے۔"(۹)

یہی وہ بے تکلفی اور بے حجابی ہے جو ان مکاتیب کی عظمت کو چار چاند لگاتی ہے اور بے تکلفی اور بے حجابی کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس ضمن میں صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں:

"جب انسان اپنے کسی عزیز یا دوست کو خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی غیریت باقی نہیں رہتی بلکہ بسا اوقات دوئی کا پردہ بھی اُٹھ جاتا ہے۔۔۔ وہ اپنی رائے میں آزاد ہوتا ہے نہ دوسروں سے چوکتا ہے۔ نہ اپنے آپ کو چھوڑتا ہے اس وقت اُسے نہ خوف لائم ہوتا ہے اور نہ نکتہ چیں کا کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھاتی ہے۔"(۱۰)

ان خطوط کی جاذبیت کا اہم عنصر احمد بشیر کا اپنی بیگم کے ساتھ رومانس ہے اور انداز بیان نے بھی غضب ڈھایا ہوا ہے۔ بیگم احمد بشیر لکھتی ہیں کہ امریکا میں وہ:

"فیملی کو بہت مس کرتے تھے۔ اس دوران انہوں نے مجھے بہت محبت بھرے خط بھی لکھے جن کو پڑھ کر میرا وقت خوش اسلوبی سے گزر تا چلا گیا۔"(۱۱)

احمد بشیر کے یہ خطوط گل ہائے رنگ رنگ کے مصداق ہیں۔ ان میں بیوی سے محبت کا اظہار ہے تو کہیں علمی و ادبی مباحث بھی ملتے ہیں تو کہیں تاریخی شواہد کے نئے دریچے وا ہوتے ہیں۔ تو کہیں ثقافت کی حلاوت محسوس ہوتی ہے۔ تو کہیں ایک شفیق باپ کی شفقت پدری کے جلوے دکھائی دیتے ہیں تو کہیں باپ بیٹے میں نظریاتی کش مکش کا رنگ ہمارے سامنے آتا ہے۔ کہیں دوستی کے سلسلے دراز ہیں تو کہیں دشمنی کا رنگ بھی خصوصاً حفیظ جالندھری سے مخاصمت کا تذکرہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ دراصل حفیظ جالندھری اس محکمہ کے افسر بالا تھے۔ احمد بشیر ابن انشا اور ممتاز مفتی اس کے ماتحت تھے۔ انشاء ابن حفیظ جالندھری کو جالندھر سے جانتے تھے بلکہ پہچانتے تھے اور یہ سب کچھ ابن انشا نے احمد بشیر اور ممتاز کو بتا دیا تھا اور اس وجہ سے حفیظ کے تعلقات ان سے مناسب سطح پر نہ رہ سکے۔ احمد بشیر کے امریکا سے محمودہ احمد بشیر کو لکھے جانے والے ہر دوسرے یا تیسرے خط میں حفیظ کا تذکرہ منفی حوالے سے ہی ملتا ہے اور اس کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ حفیظ جالندھری احمد بشیر کو امریکا نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ حفیظ کی غیر موجودگی میں ابن انشا نے ان کا امریکہ جانے کا کام مکمل کروا دیا تھا۔ اس ضمن میں ابن انشاء کے متعلق احمد بشیر اپنی بیگم کو امریکا پہنچ کر لکھتے ہیں:

"انشا کا شکریہ ادا کر دینا۔ یہ سارا کام اسی نے کرایا ہے۔ حفیظ نے تو فائل پر لکھ دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں۔ پھر حفیظ لاہور چلا گیا تو بعد میں انشاء نے کرایا۔ اس کے بعد حفیظ نے واپس آکر انشاء کی بہت بے عزتی کی۔ مگر اس بے چارے نے کرا دیا۔"(۱۲)

اس کے بعد حفیظ نے ابن انشا کے دفتر میں رہنا محال کر دیا۔ احمد بشیر اپنی بیگم کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"انشاء حفیظ کے ہاتھوں تنگ آکر نوکری ڈھونڈ رہا ہے۔"(۱۳)

ممتاز مفتی کو بھی احمد بشیر کی قربت کی سزا ملنے لگی تھی اور وہ بھی کراچی سے لاہور جانے کا پروگرام بنانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس سے متعلق احمد بشیر مزید لکھتے ہیں:

"کراچی سے ممتاز کی چٹھی آئی ہے۔ وہاں کے حالات ٹھیک نہیں۔ ممتاز بھی لاہور جا رہا ہے۔ انشاء بھی چھوڑ رہا ہے اور مجھے بھی چھوڑنا پڑے گا۔"(۱۴)

اوپر سے مہربان دوستوں کی پریشانی کی اطلاعات نے انہیں خاصہ پریشان کیے رکھا۔ درج ذیل اقتباس میں اس ذہنی کوفت کی عکاسی ہوتی ہے:

"اب حفیظ کے پاس میں نہیں رہ سکتا۔ اس (کمینے) نے زندگی حرام کر ڈالی ہے اور میری نیت بدل ڈالی۔ ہر وقت سوچ فکر غصہ اور بے چینی میں ہنسنے کھیلنے والا آدمی! اس نے مجھے خاموش، سنجیدہ اور فکر مند بنا دیا۔ اب مجھ سے اس کی شکل بھی برداشت نہیں ہوتی۔"(۱۵)

پردیس میں جب ایسی خبریں ملیں تو آدمی کا بے چین و بے قرار ہونا یقینی ہوتا ہے۔ اور احمد بشیر بھی اس مرحلے سے گزرے اور خوب گزرے اور خوب اس لیے کہ امریکا میں انڈیانا یونیورسٹی کی سخت سردی اور بے مزا کھانوں کے ساتھ تعلیم کے حصول کے اور اس کوفت میں راحت کا سامان بھی ان کی مکتوب نویسی ہی میں تھا کیونکہ مکتوب نگاری نے ان کی اپنے دوستوں، بچوں اور بیگم سے آدھی ملاقات کی بزم سجائے رکھی اس بزم کی شمع تو یقیناً محمودہ احمد بشیر یعنی ان کی زوجہ ہی ہیں۔ مگر اپنے بچوں سے محبت، بے تکلف اور بے ساختہ چاہت بھی ان مکاتیب کی ایک اہم بات ہے۔ اپنی بیٹی نیلم کو مخاطب کرتے ہوئے سبھی بیٹیوں سے اپنی محبت ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں:

"میرا پیارا سور بچہ نیلا جانا پو پا گو پا اُلو پٹھہ "(۱۶)

بشریٰ انصاری کو لکھے خط میں بیٹی کو کس طرح حوصلہ اور شاباش دے رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی علم و عرفان کے حصول اور آرٹسٹ کے لیے اس کی اہمیت بھی اُجاگر کر رہے ہیں:

"تم کام بہت اچھا کر رہی ہو۔ ہما اکبر کو تم نے پیٹ دیا ہے۔ نالائق کبھی باپ کا کالم بھی پڑھا کرو تاکہ تمہیں کچھ عقل بھی آجائے۔۔۔ آرٹسٹ کو فکشن، ڈرامہ، ادب اور سیاست سے بھی باخبر ہونا چاہیے ورنہ وہ کرداروں اور خیالوں کے گہرے ماڈل کہاں سے لے گا۔ پھر commitment کا بھی سوال ہے۔"(۱۷)

نیلم اور اس کے شوہر میں ان بن ہو گئی تو اس کے شوہر اور اپنے داماد ڈاکٹر سراج کو نیلم کے متعلق لکھتے ہیں:

"نیلم میں کوئی خرابی نہیں۔ اگر ہوتی تو اب تک آپ کو معلوم ہو گئی ہو گی۔ مگر نہیں ہے۔ وہ عجیب طرح سے تراش کر بنی ہے۔ اس کے خیالات پختہ اور کردار محکم ہے۔۔۔ آپ اس کو پیار سے رکھتے ہیں۔ مگر وہ عزت کی مستحق بھی ہے اور عزت مساوات سے ظاہر ہوتی ہے۔ خدا کی قسم! آپ نہایت ہی خوش قسمت ہیں۔ آپ کے کسی دوست کو ایسی بیوی نہیں ملی۔ کیا آپ کو اس کا احساس ہے؟ نیلم میں اس کے سوا کوئی نقص نہیں کہ وہ برتن توڑتی ہے مگر وہ دل نہیں توڑتی۔

آپکا احمد بشیر

لاہور۔ پاکستان"(۱۸)

اس اقتباس میں احمد بشیر کے الفاظ بڑے نپے تلے ہیں اور ان الفاظ سے وہ نیلم سے اپنی محبت کا اظہار بھی کر رہے ہیں اس کے میاں کو مزید رسیلا ہونے کی ترغیب بھی دے رہے ہیں ازدواجی زندگی کی رعنائی اور چاشنی کا مقام و مرتبہ بھی بتارہے ہیں کہ عزت مساوات سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ خط بزرگانہ شفقت، ادیبانہ عظمت اور حکیمانہ دانش کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ان خطوط میں پروین عاطف کو بھی کئی جگہ مخاطب کیا گیا ہے بلکہ اسے ماں بننے پر مبارک باد بھی دی ہے۔ نواسوں نواسیوں داماوں کو بھی خطوط لکھے ہیں۔ جن میں بزرگانہ اور مدبرانہ اندازِ نگارش ملتا ہے اور حرف حرف سے بزرگی اور شفقت کا ظہور ہوتا ہے اور ساتھ ہی کرنل عباس (داماد) کو لکھے گئے خطوط میں دل کی بینائی کی باتیں کی گئی ہیں اور آنے والے لمحات کو چشم تصور میں دیکھ کر بیان کیا گیا ہے۔

احمد بشیر کو سب نے مانا مگر اسے اپنے بیٹے ہمایوں عرف ہومی نے نہ مانا اور احمد بشیر نے پھر قلم کے زور سے بیٹے کے نام خطوط میں علمی، فکری اور نظریاتی انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور یہ خطوط احمد بشیر کی نظریاتی سوچ کے ترجمان ہیں اور ان کی علمی و ادبی خوبیوں کے حامل ان خطوط میں احمد بشیر کے فکر کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے اور یہ جذبہ بھی نمایاں ہوتا ہے کہ آنے والے ایام میں حالات کیا اور کیسی کروٹ لے سکتے ہیں اور الفاظ کا چناؤ اور روانی بیان ان کے سکہ بند ادیب ہونے پر دلالت کرتی ہے اور ان کی طبیعت کی خودسری ان کے الفاظ میں بڑی نمایاں ہو کر ستاروں کو نظروں سے گرا دینے کا اعلان کرتی ہے۔ ساتھ ہی یہ خطوط ضیائی مارشل لائی دور کی منفرد عکاسی بھی کرتے ہیں اور عالمی تغیر و تبدل اور آنے والی عالمی تبدیلیوں کے بھی غماز ہیں۔ "عرب سپرنگ" کے متعلق انہوں نے انھی خطوط میں لکھا تھا اور ایشیا کے تبدیل ہونے کا مژدۂ جانفزا انہی خطوط کی سطروں میں موجود ہے۔

ان خطوط کی اہمیت اس لیے بھی بہت زیادہ ہے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو دنیا میں آنے والی تبدیلیوں سے باخبر کر رہا ہے اور آنے والے دور کی لفظی تصویر ان میں بڑی واضح ہے۔ دوسرے خط میں ضیائی شورائی مارشلائی نظام کے بارے میں اس دور کے ملکی حالات کی باطنی حالت کا بیان ہے جو اس دور کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ اسی خط میں حالات کی ایک اور لفظی تصویر بھی اس دور کی تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے اور ظاہری کام مومناں اور باطنی کام کافراں والی کیفیت کا بیان ہے۔ مدح سرائی کرنے والے ابن الوقت ریڈیو ٹی پر اس کا چرچا کرتے نہیں تھکتے تھے اور نمازی مارشل لا کی تعریف و توصیف میں "ملارموزی" (۱۹) کی گلابی اردو کو بھی پیچھے چھوڑ گئے تھے مگر بقول احمد بشیر:

> "ملک میں ایسے لگتا ہے کہ آکسیجن کم ہو گئی ہے۔ کوڑے مار مار کر لوگوں کو شل کر دیا گیا ہے۔ اب تک لاکھوں آدمیوں کو مار پڑ چکی ہے اور روزانہ بڑی شان سے ریڈیو ٹی وی پر اس کا چرچا ہوتا ہے اور اخبارات میں سراہے ہوئے لوگوں کی تصویریں چھپتی ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ جرائم میں

اضافہ ہو رہا ہے۔ بنک لوٹے جا رہے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کو اغوا کیا جا رہا ہے، قتل ہو رہے ہیں۔"(۲۰)

احمد بشیر کا اکلوتا بیٹا ہمایوں امریکا میں مقیم ہے اور ایک کامیاب کاروباری زندگی گزار رہا ہے اور احمد بشیر کو ایک ناکام اور وقت کا ضیاع کرنے والا شخص قرار دیا مگر احمد بشیر نے چپ کا روزہ نہ توڑا مگر جب حالات کی کتاب پڑھ کر بیٹے نے باپ کو خبطی سمجھنا شروع کر دیا تو پھر انھوں نے صبر و تحمل کے پھل سے روزہ افطار کرتے ہوئے انسانیت کی بقا، غربت اور بھوک سے پاک معاشرے کے قیام کی جدوجہد کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے رکھا۔ لکھتے ہیں:

"بعض لوگ بغاوت کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اگرچہ سب کامیاب نہیں ہوتے۔ مگر بغاوت میری ذاتی آسودگی و آسائش کے لیے نہیں تھی بلکہ مخلوق کی آسودگی اور آسائش کی خاطر تھی اور میرے بعد اور لوگ بھی تاریک گلیوں میں مارے جائیں گے اور یہ عمل چلتا رہے گا جب تک انسانیت غم اور بھوک سے آزاد نہیں ہو جاتی۔"(۲۱)

باپ بیٹے میں زندگی گزارنے کے ڈھب کے متعلق ذہنی بعد جب حد سے بڑھ گیا تو پھر احمد بشیر نے اپنے دل کے آسمان کے چاند سے بھی پیارے اپنی آنکھ کے تارے کو بھی نظروں سے گرانے سے بھی گریز نہ کیا اور ان کے اشہب قلم نے موتی بکھیرنے شروع کر دیے۔ دنیاوی طور پر ناکام زندگی گزار کر نظریاتی کامیابی کے متعلق لکھتے ہیں:

"میرا قصور فقط اتنا ہی ہے نا کہ میں کسی ایسے نظام کی تلاش میں ہوں جس میں بوڑھے لوگ زکوٰۃ خیرات نہ کھائیں اور سب کو ملتی بھی کہاں ہے بلکہ ریاست ان کی کفالت کرے کیونکہ انہوں نے جوانی میں ٹیکس دیئے ہیں اور کام کیا ہے۔ کیا یہ کفر و الحاد ہے؟ حکیم کو اپنی حکمت پر ناز ہوتا ہے، پہلوان کو اپنی پہلوانی پر، ادیب کو اپنی ادبی تخلیق پر، مولوی کو اپنی دینداری پر، سیاستدان کو اپنی بصیرت، حکمران کو اپنی حکومت پر۔۔۔ مگر یہ کیا ستم ہے کہ تم کاروبار میں کامیاب ہوئے تو حکیم بھی ہو گئے، پہلوان بھی ہو گئے، سیانے بھی ہو گئے اور لگے ہر ایک پر تنقید کرنے۔ ہر ایک کو بے دین سمجھنے، ہر ایک کی توہین کرنے اور ہر بات میں بڑا اور برگزیدہ بننے۔ تمہارے دل کا صحن بڑا کشادہ ہے مگر ذہن ایک بند گلی ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ سچائی کے سو روپ ہیں۔ ہر ایک کا زندگی گزارنے کا انداز اپنا ہے اور ہر ایک کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ اگر ہو سکے تو لوگوں کو جینے دو، کسی کی توہین نہ کرو۔ کچھ عاجزی اختیار کرو۔ بندے بنو، خدا نہ بنو۔۔۔یہ بھی سوچو کہ کہیں تم arrogance of success اور authority of ignorance کے شکار تو نہیں ہو گئے۔ اگر تم

کہیں بل گیٹس ہو گئے تو آدھی دنیا کو زندہ جلا دو گے اور اس میں تمہارے ماں باپ بھی شامل ہوں گے۔"(۲۲)

ممتاز مفتی نے احمد بشیر کو اور احمد بشیر نے ممتاز مفتی کو عمر بھر اپنا بنائے رکھا۔ انہوں نے جوانی کی دیوانی اور مستانی زندگی بھی مل کر گزاری جوانی میں جنس مخالفت کی کشش ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور یہ باتیں دوست دوستوں سے کرتے یا لکھتے ہیں۔ ممتاز مفتی کے نام ایک خط میں احمد بشیر کا امر تا پریتم کے متعلق دوستانہ اور بے تکلفانہ انداز ملاحظہ ہو:

"تمہارے ساتھ ہی لاہور جناح کالج کو چٹھی لکھ دی ہے۔ اور اس قدر حسین ملکہ کا شادی شدہ ہونا بھی کوئی discredit نہیں۔ اُسے بھی خط لکھ دیا ہے۔ امر تا پریتم بھی بھولی نہ تھی۔۔۔ مگر سنو یار ساحر کے ساتھ پھنسی ہے۔ پست قامت سانولی سلونی، تیکھی، تیز اور رسیلی۔ نشہ ملی جیسے دیسی شراب۔"(۲۳)

احمد بشیر کی کئی اور لوگوں سے بھی خط و کتابت ہوتی رہی اور ان میں ایک نام ابن انشا کا بھی ہے جس کے محررہ خطوط احمد بشیر نے شاید اس سے کئے جانے والے وعدے کی وجہ سے تلف کر دیئے۔ مگر احمد بشیر کے ابن انشاء کو لکھے خطوط بھی کوشش کے باوجود کہیں سے بھی دستیاب نہ ہو سکے۔ احمد بشیر کے منہ بولے بیٹے مجید کے نام قریباً ۴۴ خطوط بھی اس کتاب کا ایک اہم حصہ ہیں اور انھوں نے ان مکاتیب میں بھی علمی، ادبی ثقافتی اور تاریخی، حقائق کی گرہ کشائی کی ہے۔

اردو زبان، کلچر، مساوات، قومی لباس، روایت اور پاکستانیت کا ذکر اور اس کا اظہار اپنے منہ بولے بیٹے سے کرتے ہوئے تاریخ، جرأت، سچ، بے باکی اور اس میں سادگی، روانی اور معلومات کی فراوانی سب کچھ اس خط میں موجود ہے۔ مجید چونکہ کراچی میں رہتا ہے اور مہاجر ہے۔ احمد بشیر سیاسی حوالے سے مہاجروں کی نمائندہ جماعت کو ملکی حوالے سے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور یہی تذکرہ انہوں نے اپنے ناول "دل بھٹکے گا" میں بھی کیا ہے جس پر مجید بھی ناراض ہوا اور مجید نے بقول احمد بشیر:

"آدھا ناول پڑھ کر تم نے عصمت چغتائی کو حکم دیا کہ وہ میرے ہاتھ چومے باقی آدھا پڑھ کر تم خاموش ہو گئے۔"(۲۴)

احمد بشیر کے یہ خطوط بھی کمال کے رنگ دکھاتے ہیں۔ مجید کے نام ایک خط میں ادیب کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:

"ادیب وہ ہوتا ہے جو زندگی کی کوئی توجیہ پیش کرے۔ کوئی زاویہ نکالے۔ کوئی تجزیہ پیش کرے۔"(۲۵)

مزید یہ کہ کاریگر اور کرافٹس مین ہونا اور چیز ہے اور ادیب ہونا بالکل جدا ہے۔ جس طرح ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی اسی طرح ہر لکھنے والا ادیب نہیں ہوتا۔ اس کی مثال بھی اسی خط میں یوں دیتے ہیں:

https://tasdeeq.riphahfsd.edu.pk

"لوگ ابن صفی کو کاریگر اور کرافٹس مین تو مانتے ہیں، ادیب نہیں مانتے۔"(۲۶)

الغرض احمد بشیر کے ان مکاتیب میں یاری دوستی کے رنگ بھی ہیں اور علم کی امنگ بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ پیار محبت اور خلوص کی ترنگ بھی ہے اور ان کے سچ، فکر، سوچ، نظریے اور خیالات سے ٹکرانے والوں سے کھلم کھلا اعلانِ جنگ بھی ہیں۔ چاہے اس مقام پر ان کا اپنا بیٹا اور منہ بولا بیٹا ہی کیوں نہ ہو انہوں نے انہیں بھی اپنی کمزوری نہیں مانا اور بشیروی فکر کی تلوار کی دھار کو کند نہیں ہونے دیا۔ مثلاً بیٹے کو لکھتے ہیں:

"میں نے تمہاری آنکھ میں محبت کی گرمی اور احترام کی نرمی نہیں دیکھی تو کیا مجھے خرچ دے کر تم صرف اپنا اسلامی فرض پورا کر رہے ہو؟ پھر تو یہ کوئی خیرات ہوئی، خوں کا دباؤ نہ ہوا۔"(۲۷)

واقعی ان دنوں قلم نے بھی بیماری کی طرف داری شروع کر دی تھی لیکن احمد بشیر کے ہاں منظر جلد بدلتے تھے اور ان کی بشیروی روح کی خودمِ آخر تک بھی قائم و دائم تھی۔ علالت کے شدید حملے اور قلمی عدم تعاون کے باوجود ذہن ان کا بھرپور معاون رہا۔ دسمبر ۲۰۰۴ء میں احمد بشیر سروسز ہسپتال میں داخل کروا دیئے گئے۔ یہ ان کے بستر علالت سے تحریر کی جانے والی آخری تحریر ہے:

"بھائی افتخار عارف! آپ نے یہاں آ کر مجھ پر احسان کیا۔ اور اس کے ساتھ ہی پچیس ہزار کا ایک چیک چھوڑ گئے۔ چونکہ چودھری پرویز الٰہی نے مجھے ایک لاکھ روپیہ دے دیا تھا۔ اس لیے مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں۔ میں یہ چیک واپس کرتا ہوں۔ امید ہے آپ اسے میری ناشکری نہ سمجھیں گے۔ زندہ رہا تو شاید ملاقات ہو۔

آپ کا نیاز مند

احمد بشیر بیماری کی وجہ سے میری بدخطی۔۔۔ ہوئی ہے۔

آپ کا نیاز مند

احمد بشیر"(۲۸)

آخر میں ان خطوط کی بے ساختہ اور سچائی کی تصویر کے حوالے سے یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ احمد بشیر نے ان خطوط کو چھپا کر رکھنے یا پھاڑ دینے اور بلاوجہ کسی کو نہ دکھانے کا بھی لکھا ہے اور یہ سب باتیں احمد بشیر کی شخصیت، کردار، نفسیات، سوانحی اور بشری معاملات کی سچی لفظی تصویر ہیں۔ ڈاکٹر محمد سلیم لکھتے ہیں:

"کسی بھی شخص کے خطوط اس کی نفسیاتی سوانح ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس نیت سے نہ لکھے گئے ہوں کہ بعد میں چھپ جائیں گے۔"(۲۹)

احمد بشیر کے ان مکاتیب میں معلومات، راز و نیاز، بشری خواہشات، علمی اور ادبی فنی اور فکری محاسن کا ایک جہان آباد ہے اور اس جہان میں احمد بشیر کی لفظی تصاویر، ان کے قلم کی زد میں آنے والی شخصیات کی سچی جھلک اور نجی جذبات جو خطوط ہی میں کسی

اپنے کو، کسی پیارے کو، کسی ہمدرد کو اور کسی ہم راز کو لکھے جاسکتے ہیں اور بغیر کسی بناوٹ کے لکھے اور خوب لکھے اور اشاعت کی نیت سے لکھنے کا سراغ دور دور تک نہیں ملتا۔ اس صنف ادب کی ادبی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ احمد بشیر جیسے مہان کہانی، لکھاری اور منفرد انشاپرداز نے اپنی آخری لکھت اسی صنف میں لکھی۔ ان خطوط کو پڑھ کر قاری رنگین اور رسیلے احمد بشیر کے ساتھ ساتھ شفیق باپ، محنتی انسان، باوقار عالم، جنونی فلم ساز اور ہدایت کار، پکے اور سچے سوشلسٹ، ماہر سماجیات و سیاسیات، ترقی پسند سوچ اور فکر کے علم بردار، احمد بشیر سے بھی فیض یاب ہوتا ہے۔ الفاظ نہیں کتابیں اس کے گرد طواف کرتی ہیں۔

# حوالہ جات


۱۔ مظفر عالم جاوید، معیاری اُردو خط و کتابت، لاہور، امین بک ڈپو، لاہور،، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲

۲۔ احمد بشیر، خطوں میں خوشبو، مرتبہ نیلم احمد بشیر، لاہور، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶۵

۳۔ ایضاً، ص ۶۹

۴۔ ایضاً، ص ۶۰

۵۔ ایضاً، ص ۵۹

۶۔ ایضاً، ص ۵۸

۷۔ ایضاً، ص ۵۹

۸۔ ایضاً، ص ۴۸

۹۔ ایضاً، ص ۲۰

۱۰۔ صالحہ عابد حسین، پیش لفظ، آوازِ دوست،، ادب پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۱۹۹۴ء، ص ۲

۱۱۔ محمودہ احمد بشیر، دو تحریریں، میں اور احمد بشیر، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص ۲۱

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۵

۱۳۔ خطوں میں خوشبو، احمد بشیر، مرتبہ: نیلم احمد بشیر، ص ۶۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۶۲


https://tasdeeq.riphahfsd.edu.pk

۱۶۔ ایضاً، ص۸۱

۱۷۔ ایضاً، ص۸۲۔۸۳

۱۸۔ ایضاً، ص۸۴

۱۹۔ ملا رموزی کی اردو کو کالم نگاری میں گلابی اردو کہا جاتا ہے۔

۲۰۔ ایضاً، ص۸۷

۲۱۔ ایضاً، ص۹۵

۲۲۔ ایضاً، ص۹۶

۲۳۔ ایضاً، ص۱۶۰

۲۴۔ ایضاً، ص۲۲۰

۲۵۔ ایضاً، ص۲۲۳

۲۶۔ ایضاً، ص۲۲۳

۲۷۔ ایضاً، ص۹۶

۲۸۔ ایضاً، ص۱۶۲

۲۹۔ محمد سلیم، ڈاکٹر، شبلی نعمانی حیات و تصانیف، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۱۶۶